بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثّرات

گزشتہ ایک عرصے میں سامنے آنے والے شواہد سے اِس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ مُسلم دُنیا میں تاریخ ایک نیا اور بہت اہم موڑ کاٹ رہی ہے۔ تاریخ کی اِس حرکت کی نوعیّت قدری ہے اور اس کے مضمرات وسیع بھی ہیں اور بہُت سارے اِعتبارات سے مُبہم بھی۔ اِس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اِسلامی تہذیب کے اُصُول، اس کے مَظاہر اور تاریخی عمل کے باہمی رَبط کی نوعیّت کا جائزہ لینا ہوگا۔

مُسلم دنیا پر استعماری غلبے اور اس کے بعد آزادی کی موج کے ظہور تک ایک بہُت بڑی تبدیلی آچکی تھی اور وہ یہ کہ مُسلم اقتدار کے تسلسل نے اِنسانی زندگی کے فوری مؤثرات کو اپنے قابُو میں رکھنے کا جو نظام تخلیق کیا تھا، وہ قوّتِ نافذہ کے چھن جانے، اِس دوران میں عالمی سطح پر نئے مؤثّرات کے ظہور اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ایک یکسر نئی صُورتِ حال کے سامنے آنے سے بہت حد تک متروکات کی ذیل میں داخل ہوگیا۔ یہاں یہ امر پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ دِین اور اس سے پھُوٹنے والی تہذیب کی دو سطحیں ہوتی ہیں ——— ایک اس کی داخلی اور اصولی وحدت، جو حقیقت سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے لازمانی ہے ——— اور دُوسری اس اصولی وحدت کے تاریخ پر عمل سے پیدا ہونے والے مظاہر کا ایک ایسا نظام ہے، جو زمانی ہونے کے اِعتبار

سے اصول تغیر کے تابع ہے۔ اسلامی تہذیب کی ان دو سطحوں کی مختلف حیثیتوں اور تاریخ میں ان کو برتنے کے اسلوب سے متعلق بہت خلطِ مبحث ہوا ہے اور آج مسلم ذہن کے سامنے اہم ترین سوال یہ ہے کہ تہذیبی تشکیلِ نو کے عمل سے گزرتے ہوئے ان عناصر کے درمیان وہ تناسب کس طرح رکھا جائے جس سے مندرجۂ ذیل نتائج حاصل ہو سکیں:

۱۔ اسلام اپنی دینی حیثیت میں بلا کسی انسانی کتر بیونت کے ایک زندہ قوت کے طور پر برقرار رہے اور اس مقصود سے قریب تر ہوتا جائے، جس کے لیے یہ پیغام بھیجا گیا تھا۔

۲۔ اسلام کی تہذیبی تشکیلِ نو کے عمل میں ان عناصر کا تحفظ کس طرح کیا جائے، جو اس کی تہذیبی واردات نے پیدا کی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان عناصر کو عالمی تہذیب کے منظر پر ایک تاریخ ساز اور موثر قوت کی حیثیت کیسے دی جائے؟

۳۔ اُمت کے موجودہ اسلوبِ حیات میں وہ کیا تصرف کیا جائے، جس سے مختلف سطحوں پر جمود رفع ہو کر ایک ایسا نظام پیدا ہو، جو تاریخ میں نتیجہ خیز ہونے کی حیثیت سے دوسرے نظاموں پر فوقیت رکھتا ہو اور اپنا موثر ہونا خود اپنی داخلی قوت سے ثابت کر سکے۔

۴۔ ایسے ادارے کس طرح تخلیق کیے جائیں، جو باہمی عمل اور تعاون کے ذریعے وہ وسیع اور پیچیدہ تہذیبی بُنت پیدا کر سکیں، جس کی ایک مکمل انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس مقصود کے تعین کی ضرورت یوں پڑتی ہے کہ آج دنیا کی مختلف تہذیبوں میں ایسے ادارے موجود ہیں، جو حیاتِ انسانی کے ایک پہلو کی تسکین بطریقِ احسن کر سکتے ہیں، لیکن مکمل انسان اور اس کی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور روحانی ضرورتوں کا کوئی تصور ان کے سامنے موجود نہیں ہے۔

۵ ۔ امّت کو بحیثیتِ مجموعی کس طرح اس قابل بنایا جائے کہ وُہ خارجی مہیّجات کے جواب میں عمل اور ردِّعمل کے ایک بے مقصد دائرے سے نکل کر اپنی داخلی قوّت نمُو کے تقاضوں کے تحت اپنی تاریخی سمت سفر متعیّن کر سکے اور اس طرح ایک زندہ وجود کی حیثیت سے تاریخِ عالم کے اصولِ حرکت کو کسی حد تک اپنی مرضی کے مطابق ایک شکل دینے میں کامیاب ہو۔

یہ سوالات بہت بڑے اور اہم ہیں اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا کوئی ''ریڈی میڈ'' جواب بھی کسی کے پاس موجُود نہیں ہے، لیکن یہ بات اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ اجتماعی بقا اور انفرادی تشخّص کا دار و مدار ہی انھی سوالات پر رہ گیا ہے۔ تاریخ کی تیز تر ہوتی ہوئی حرکت میں اپنے قدم جمانے اور سمتِ سفر واضح کرنے کے لیے ان سوالوں کے جواب پانے کی کوشش ایک فوری اور اٹل لازمے کے طور پر سامنے آتی ہے۔

(۲)

سوالات انفرادی ہوں یا اجتماعی، خارجی تاریخ کے بہاؤ میں نامیاتی تحفّظ کے تقاضوں سے ہی اُبھرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا پیدا ہونا، جس میں یہ اور اس طرح کے سیکڑوں دُوسرے سوالات پیدا ہوتے جاتیں، خود تاریخ کی کروٹوں کا ایک نتیجہ ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ سوال پہلی بار پُوچھے گئے ہوں، بلکہ تاریخ کے وسیع منظر میں اور آج اُمّت کے اندر اور باہر مختلف گروہ اس طرح کے سوال اُٹھا رہے ہیں اور اپنے اپنے طور پر اُن کے جواب کی تلاش میں بھی سرگرداں ہیں، لیکن اس فکری جدّ وجہد نے ابھی تک کوئی ٹھوس رُخ اختیار نہیں کیا، کیونکہ زمانے کے چیلنج نے ابھی

نوعیت اختیار نہیں کی کہ یہ سارے گروہ کسی بڑے تناظر میں یکجا ہو کر اپنی قوتوں کی تنظیم کریں اور اس طرح ایک ایسی شدت اور ایک ایسے ارتکاز کو جنم دیں، جو تاریخ کے عام بہاؤ کو توڑ کر اس میں کوئی موثر اور گہری تبدیلی پیدا کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تہذیبی منظر نامے پر یہ انتشار محض تفریحاً پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کی تہ میں بہت بڑے موثرات کام کر رہے ہیں، اس لیے اسے محض نیک اور پُرخلوص جذبات کے اظہار سے دُور بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے خود اپنی تاریخ، اپنے تہذیبی مزاج اور اس کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک ایسا لائحہ عمل تخلیق کرنا پڑے گا، جو ان موثرات پر براہِ راست اثر انداز ہو اور ان کے اندر کوئی بڑی تبدیلی پیدا کرے۔ اس خواہش سے پہلے یہ غور کرنا بھی ضروری ہوگا کہ کیا نصب العین کے حصول کے یقین کا کوئی ایسا تصور آج موجود ہے جس کے پیشِ نظر اُمت کے ذہنی اور مادی وسائل کو بڑے پیمانے پر اس نصب العین کے لیے وقف کیا جا سکے۔ بلند آہنگ لفاظی سے قطع نظر اس امر کے شواہد بہت کم ہیں کہ ایسا کوئی تصور بڑے پیمانے پر کارفرما ہو۔

انسانی تہذیب کے رموز پر گہری نظر رکھنے والے ایک عالم نے کہیں لکھا ہے کہ زوال دُنیا کی تمام تہذیبوں میں آیا، لیکن اس کے موثرات الگ الگ ہیں۔ مشرقی تہذیبوں کا زوال سکونی ہے۔ یعنی مشرق اپنے حقائق کو سمیٹ کر سویا رہا اور اس نے انھیں تاریخ کی حرکت سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مغرب کی تہذیب کا زوال حرکی ہے۔ یعنی وہ حقائق کونیہ اور حقائقِ انسانیہ کو سمجھے بغیر متحرک ہوا۔ چنانچہ اس کا زوال گم کردہ راہ ہونے سے پیدا ہوا۔

عام طور پر تہذیبی زوال کے سلسلے میں یہ بات کہی اور سمجھی جاتی ہے کہ اگر ایک مرتبہ تہذیب زوال کا شکار ہو جائے، تو دوبارہ اپنی اصلی شکل میں عروج نہیں پاتی۔ سپنگلر اور اس کے دیگر متبعین نے تو خیر اسے ایک اصول کی حیثیت دے دی ہے اور عام

مشاہدہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اُوپر جو اصول تہذیبوں کے زوال کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ ہر تہذیب اپنے اصل مزاج میں بگاڑ سے زوال آمادہ ہوتی ہے اور اس کا مابہ الامتیاز عنصر ہی حدِ تناسب سے آگے بڑھ کر اس کے زوال کا سبب ہوتا ہے، لیکن اسلام کے سلسلے میں ہمیں ذرا ایک مختلف اندازِ نظر اختیار کرنا پڑے گا اس کی وجہ یہ نہیں کہ بحیثیت مسلمان یہ بات قبول نہیں کی جا سکتی کہ اسلامی تہذیب بھی زوال کا شکار ہو سکتی ہے۔ اسلامی تہذیب کو زوال ہوا ہے اور آج بھی یہ معرضِ زوال میں ہے، لیکن اس کے کچھ استثنائی نکات ہیں، جو اس کی صورتِ حال کو دُنیا کی دُوسری تہذیبوں سے الگ کرتے ہیں۔

اسلام کے بارے میں یہ بات عموماً کہی جاتی ہے کہ صرف جغرافیائی طور پر ہی نہیں، بلکہ مزاجاً بھی اسلامی تہذیب مشرق و مغرب کے درمیان ایک پُل ہے۔ اِس اعتبار سے اس میں حرکت اور سکون کے دونوں عناصر موجود ہیں۔ اس کا باطن، جو حقائق سے عبارت ہے، وہ سکونی ہے اور اس کا ظاہر، جو تاریخی ظہور سے متعلق ہے، وہ حرکی ہے۔ چنانچہ اسی طرح اس کی تہذیب کا زوال بھی مرکب ہے یعنی اس کے زوال میں حقائق کی فراموشگاری بھی پائی جاتی ہے اور تاریخ کی حرکت اور اس کے مؤثرات کی طرف سے بے نیازی بھی، لیکن معاملہ یہ ہے کہ اسلام صرف تہذیب نہیں ہے بلکہ تہذیبِ اسلام کے ثانوی مظاہر میں سے ایک شے ہے اور تہذیب کا لفظ بھی کیوں استعمال کیجیے ——— یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اسلام تہذیبوں کے ایک سلسلے/نظام کی علت ہے۔ چنانچہ تہذیبی مظاہر اور نظاموں کے عروج و زوال سے اسلام کی اپنی اصولی حیثیت پر کوئی ضرب نہیں پڑتی بلکہ ایک مظہر کے زوال پاتے ہی وہ اس کی جگہ کوئی دُوسرا مظہر تخلیق کر دیتا ہے۔ تہذیبوں کی اس کثرت میں اصولِ وحدت علتِ موجبہ یعنی حقیقتِ دین خود ہے۔ ان تہذیبوں کے درمیان کسی زمانی تسلسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔ تہذیب کے مظہر کا مطالعہ کرنے والوں

نے اسلامی تہذیب میں وحدت و کثرت کے نظام کا جائزہ لیتے ہوئے عام طور پر پھیر ٹھوکر کھائی ہے، جہاں انھوں نے مظاہرِ تہذیب کو حقیقتِ دین کے ہم معنی قرار دے کر اسے عروج و زوال کے ایک نظام میں پرکھا ہے۔

اسلام میں تہذیبوں کا معاملہ عموماً زمانی ہے اور اس سے ماورا اصول اصولِ زماں یعنی تاریخ خود ہے۔ جب ہم اسلامی تاریخ کہتے ہیں، تو ہماری مراد حرکت کا وہ تسلسل ہے جو نزولِ وحی سے شروع ہوتا ہے اور آج تک اس میں وحدت پائی جاتی ہے۔ یہ طرفہ بوالعجبی ہے کہ اسلامی تہذیب کے مظاہر کو تو ایک وحدت میں پرونے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اسلامی تاریخ کو ایک واحد اکائی کے طور پر عروج و زوال کے تصور کے ساتھ رکھ کر نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اس کے مختلف ادوار کو الگ الگ اکائیوں کے طور پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی اصل میں بنیادی غلطی ہے۔ اسلامی تاریخ ایک وحدت ہے اور اس کے اصولِ ماورا یعنی حقیقتِ دین کے اعتبار سے اس میں عروج و زوال کا ایک نظام ہے اور تہذیبوں کے مختلف دائروں میں تشکیلِ نو کے عمل تاریخ کی اسی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳)

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اپنے تاریخی نصب العین سے روگردانی تہذیبی زوال پر منتج ہوتی ہے اور اس لازمانی اور غیر متغیر نصب العین کی طرف لوٹنا زوال سے عروج کی طرف لے جاتا ہے، اس امر کی کافی دلیل ہے کہ اسلامی تہذیب میں عروج و زوال دونوں کا تصور مطلق نہیں بلکہ غایت اور نصب العین کے حوالے سے اضافی ہے اور وہ طریقہ کار جسے ایک مرتبہ برت کر نتائج حاصل کیے جا چکے ہیں، وہ ہر عہد اور ہر دور میں نتیجہ خیز

ہے ـــــ آج مُسلم دُنیا میں علم وتحقیق کا کام یہ نہیں کہ وُہ عُروج وزوال کے مُروّجہ تصوّرات کو مُشرّف بہ اسلام کرنے کی کوشش کرے، اور نہ ہی یہ کہ "تہذیبی ورثے" کی خطرناک اِصطلاح کے تحت ایک زندہ اور فعّال تاریخی حقیقت کو عجائب گھر کی سجاوٹ کا سامان بنا کر بلاتفریق قدر ماضی کے ہر منظر کو سمیٹنے میں لگی رہے بلکہ اِس وقت علم وتحقیق کا منصب یہ ہے کہ وُہ مُسلم دُنیا کے سامنے چیلنج کو سمجھے اور جس جس سطح پر جُمود یا انحراف واقع ہُوا ہے اُسے حل کر کے تاریخ کے گھوڑے کی لگام میں اپنے ہاتھ لانے کی کوشش کرے ۔ عہدِ جدید میں ہمارے علمی سرمایے کا بہُت کم حصّہ ہمیں صحیح معنوں میں تاریخ کے تقاضوں کو پُورا کرنے یا مُسترد کرنے میں مدد دیتا ہے ۔ آہستہ آہستہ مُطالعات کی نہج مُردہ تہذیبوں کے مُطالعے سے مُشابہ ہوتی جارہی ہے اور علم کا تزئینی پہلُو زیادہ نُمایاں ہو رہا ہے ۔ پہلے بھی استعمار کی آمد پر ہمیں یہ اَندازہ نہیں ہُوا تھا کہ تاریخ کون سا موڑ کاٹ رہی ہے اور جب مُدّت بے خبری ختم ہُوئی، تو ہم جسمانی اور ذہنی طور پر غُلام تھے ۔ علم کے موجُودہ تصوّرات سے ایک ایسی ہی بے خبری پھر پھُوٹتی ہُوئی دکھائی دیتی ہے ـــــ ایسے لمحے میں ہمیں اپنے آپ سے کُچھ سوال پُوچھنے چاہییں اور اگر ان سوالوں کے درمیان اُمّت یا مِلّت کا لفظ آجائے تو معذرت کی ضرُورت بھی نہیں، بشرطیکہ یہ یقین ہو کہ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسُولِ ہاشمی !

سراج مُنیر